Chapter. 5

باب پنجم

کیفی اعظمی بحیثیت فلمی

کہانیوں اور قصوں کی طرح گیت سے بھی انسانی زندگی کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف ارتقائی مراحل سے گزرنے میں جس طرح قصے اور کہانیوں کی اہمیت ہے اسی طرح انسانوں کے جذبات، احساسات، اُمنگوں اور رنج وغم اور مسرت وشادمانی کے لمحات کے اظہار کے لیے انسان نے اپنی اپنی زبان میں گیتوں کا بھی سہارا لیا۔

جنگلوں اور غاروں سے گزرتے ہوئے انسان نے سماجی اور شہری زندگی کی تشکیل کی۔ اس کی زندگی کے لوازمات اور تقاضوں میں اضافہ ہوا۔ مختلف موسموں، مختلف تہواروں، مختلف موقعوں کے لیے انسان نے اپنی اپنی بولیوں، زبانوں اور لب ولہجے میں گیت گائے۔

جہاں تک اردو میں ایک مستقل اصناف سخن کی حیثیت سے گیت کے ارتقاء اور وجود کا تعلق ہے، تو ظاہر ہے کہ غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ کے مقابلاے میں گیتوں کی باقاعدہ ادبی صنف وجود میں نہیں آئی۔ لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں اس کی تلاش بے سود بھی نہیں ہے۔ خصوصاً پہلی جنگ عظیم کے بعد شعراء نے اس صنف کو ادبی حیثیت ضرور دے دی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اجمل اجملی کے اس خیال سے اتفاق کیا جا سکتا جو انہوں نے اردو گیتوں کی ابتدا اور اس کے اارتقاء پر پیش کیا ہے۔

''دراصل اردو گیت کو ادبی مقام دلانے اور اس بھولی بسری چیز کو دریافت کرنے کا سہرا رومانی تحریک کے شعراء عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی، حفیظ

جالندھری، ساغر نظامی اور الطاف مشہدی وغیرہ کے سر ہے۔ جنہوں نے گیت کے فنی سانچے کو اپنے پورے پس منظر کے ساتھ اپنایا اور پورے لوازمات کے ساتھ پیش کر کے خواص میں مقبول بنایا۔ یہ داستان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک میراجی کا نام نہ لیا جائے جو اپنی نظموں کے تمام دھندلے پن کے برعکس گیتوں میں عوامی جذبات اور احساسات کے فطری اظہار سے بہت قریب نظر آتے ہیں، اور میراجی نے گیتوں کے لیے کہا ہے ''شعر کی اولین صنف گیت ہیں۔ زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اس مقابلے میں پنپنے کے بعد فراغت کی کیفیت سے مست، ہونے کے لیے بتدائی اکیلے انسان کو سنگیت کی ضرورت تھی اور تنہائی کے لمحوں میں اس کی اپنی آواز اس کا ساتھ دیتی ہے۔''[1]

جہاں تک ہندوستان میں اردو میں گیتوں یا نغموں کی ترویج و ترقی کا تعلق ہے اس صنف کی ابتدائی اور نشو و نما میں ہندوستانی فلموں کا رول ابہت اہمیت بھی رکھتا ہے اور اس کے فروغ کی راہیں بھی ہموار کرتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ تمام تر فلمی نغمے گیت ہیں جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فلمی کہانی کا محور اور مرکز عشق و محبت کی داستان ہوتی ہے۔ اسی ایک غالب عنصر کے آس پاس پوری فلمی کہانی رفتہ رفتہ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ فلم میں اس کے علاوہ اور بھی ذیلی مناظر اور مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں گیتوں کے ذریعے تاثر اور اثر آفرینی میں اضافہ کیا جاتا ہے۔

فلموں کا ابتدائی دور ہر چند خموش فلموں کا دور رہا ہے لیکن آگے چل کر جب آواز کی گنجائش پیدا ہوئی تو گیتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور جب سائنسی ترقی

اور ٹیکنولوجی کا دور شروع ہوا اس اور بولتی فلمیں منظر عام پر آنے لگیں تو گیتوں کو بھی فلموں میں جگہ دی گئی۔ آزادی سے قبل رومانوی رجحان اور پھر ترقی پسند تحریک کی ابتدا اور عروج نے آزادی کے بعد کا یہی وہ زمانہ تھا جب ملک میں ترقی پسند تحریک کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں تھیں۔ مزدوروں، کسانوں، اور سماج کے محنت کش طبقہ کے مسائل کو ادب میں جگہ دینا اس تحریک کے اولیں مقاصد میں شامل تھا۔ آزادی ملنے کے بعد ایسے مسائل سے ہندوستان کے ہر گاؤں اور ہر شہر دوچار تھے۔ لہٰذا بالخصوص نوجوان شعراء اس تحریک سے بیحد متاثر ہوئے اس لیئے شعراء نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے غزل اور دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں نظم کا سہارا لیا۔ اور گیتوں کو فروغ دیا۔ ان میں وجوش، جاں نثار اختر، فیض، فراق، مخدوم، مجروح، مجاز، ساحر، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی سبھی شامل تھے۔

جہاں تک فلمی گیت کاروں کا تعلق ہے تو اردو نغمہ نگاروں نے جمیل مظہری، آرزو لکھنوی، نخشب، شکیل بدایونی، راجندر کرشن، شیلیندر و غیرہ نے اپنا سکہ جمایا۔ ان میں مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی وغیرہ کو بڑی اہمیت اور خصوصیت حاصل ہے۔ ان شعراء اکرام کے پیش نظر ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد اولیت کا درجہ رکھتے تھے۔ جب ان شعراء نے فلموں کی طرف رجوع کیا تو انہیں مزدوروں، کسانوں اور محنت کش طبقہ کی آواز کو موثر ترین طریقے سے پیش کرنے کا موافق ذریعہ ملا اور ان شعراء نے اپنے اپنے طور پر اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لاتے ہوئے ان صنف میں بھی اپنے خیالات سمونے شروع کیے، لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے اس مقصد کی ادائگی میں بہت حد تک کامیاب و کامران

بھی رہے۔

زیرنظر مضمون میں ہمیں چونکہ "کیفی اعظمی کی فلمی شاعری"
کا جائزہ لینا مقصود ہے۔اس لیے سب سے پہلے ان محرکات اوران عوامل جا اجمالی جائزہ لینا ضروری ہوگا جن کے زیر اثر کیفی فلمی گیتوں کی طرف راغب ومتوجہ ہوئے۔

جیسا کہ اس سے قبل لکھا گیا ہے کہ کیفی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے، نیز اس تحریک سے وابستہ دیگر اہم ہستیوں مثلاً علی سردار جعفری، سید سجاد ظہیر، اور دیگر حضرات سے وابستہ ہوئے جن کی صحبتوں سے انہیں رفتہ رفتہ پارٹی کی سطح پر نظمیں کہنے کا موقع ملا۔ابتدا میں انہوں نے رومانی شاعری کی۔جس میں بھی انقلاب اور بغاوت کا پہلو نمایاں تھا۔ یہ دور کیفی کی شاعری کا ابتدائی دور تھا۔خلیل الرحمان اعظمی نے کیفی کی ایسی رومانی اور جمالیاتی موضوعات سے لبریز نظموں کو "خوبصورت اور تراشی ہوئی نظمیں" کہا ہے۔

کیفی کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جب وہ کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی رکن بن گئے اور ان کی شاعری کا دھارا اس دور میں سیاسی اور سماجی مسائل کی طرف مڑ گیا۔

کیفی اعظمی کی شاعری کا تیسرا اور قدرے مایوس کن دور وہ ہے جب کمیونزم کا زوال واقع ہوا۔کمیونزم جہاں سے پیدا ہوا تھا وہی سرزمین اس کی قربان گاہ ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں بھی کمیونسٹ پارتی کا شیرازہ بکھر گیا۔لیکن ایسے دور میں بھی کیفی اعظمی نے حوصلہ اور ہمت سے کام لیا۔

کیفی اپنی انقلابی، سماجی اور سیاسی نظموں کے ساتھ ساتھ

گیت بھی لکھتے رہے۔ ان کے چند گیت ایسی نوعیت کے ہیں جو کسی فلمی کہانی کے تقاضہ پر نہیں لکھے گئے لیکنم بعد میں موقعہ محل کے مناسبت سے بغیر کسی ترمیم کے یا پھر جزوی ترمیم و اضافہ کے بعد کسی فلم میں فلمائے گئے ہیں۔ مثلاً حقیقت فلم کا یہ نغمہ دیکھیں۔

ہو کے مجبور مجھے اس نے بلانا ہوگا
زہر چپکے سے دوا جان کے کھایا ہوگا
دل نے کچھ ایسے بھی افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پیے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

ہو کے مجبور مجھے اس نے بلایا ہوگا

اس نے گھبرا کے نظر لاکھ بچائی ہوگی
مٹ کے اک نقش نے سو شکل دکھائی ہوگی
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہوگی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا

ہو کے مجبور مجھے اس نے بلایا ہوگا

چھیڑ کی بات پہ ارماں مچل آئے ہوں گے
غم دکھاوے کی ہنسی میں ابل آئے ہوں گے
نام پر میرے جب آنسو نکل آئے ہوں گے

سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا

ہو کے مجبور مجھے اس نے بلایا ہوگا

زلف ضد کر کے اسی نے جو بنائی ہوگی

اور بھی غم کی گھٹا مکھڑے پہ چھائی ہوگی

بجلی نظروں نے کئی دن نہ گرائی ہوگی

رنگ چہرے پہ کئی روز نہ آیا ہوگا

ہو کے مجبور مجھے اس نے بلایا ہوگا

کیفی اعظمی کے گیتوں کا مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۷۹ء میں ''میری آواز سنو'' ہندی میں شائع ہوا۔ بعد میں اردو میں شائع ہو کر اس مجموعے میں شامل گیتوں کی تعداد وہی ہے جو کسی نہ کسی فلم میں فلمائے گئے ہیں۔ اس سے قبل ۱۹۷۴ء میں اس عنوان سے اردو میں بھی شائع ہو چکا تھا۔

جیسا کہ اس مضمون کی ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ گیتوں کا تعلق انسان کے داخلی جذبات و احساسات سے زیادہ ہے، انسان اپنی زندگی کے گونا گوں مسائل و مراحل سے دوچار ہونے کے درمیان اور بھی کچھ سکون و اطمینان پانے کے بعد اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے گیت کا سہارا لیا کرتا ہے۔ ایسے گیتوں میں دیگر اصناف سخن کی طرح مجرد اوزان اور دیگر شعوری لوازمات کی سختی سے پابندی نہیں کی جاتی۔ سیدھے سادے لفظوں میں اور عام فہم پیرائے میں بات مترنم لب و لہجے میں کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ارتضا کریم اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس اعتبار سے غور کیا جائے تو کیفی اعظمی کے گیتوں میں داخلیت بھی ہے، غنائیت بھی، زبان کی سادگی نے انہیں مقبول بھی بنایا ہے۔اور ان کے گیتوں کے مضامین بھی متنوع ہیں۔''[۲]

مذکورہ بالا'' گیتوں کا مجموعہ'' ''میری آواز سنو' ایک سو چار گیتوں پر مشتمل ہے۔کسی بھی مجموعہ کلام یا تصنیف سے متعلق دیگر ناقدین یا تبصرہ نگاروں کی رائے سے زیادہ جامع و درست اور ٹھوس اظہار وخیال خود مصنف کا اپنے اور اپنے کلام کے بارے میں خیال یا عرض حال ہوتا ہے۔جو عموماً خلوص سے پُر اور تصنع سے خالی ہوا کرتا ہے۔لیکن ''میری آواز سنو'' میں شامل گیتوں کی نوعیت اور ان کے شان نزول سے متعلق کیفی نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔لیکن اس مجموعہ گیت میں شامل گیتوں کے بارے میں ان کے حسب ذیل رائے کی اہمیت وافادیت بامعنی ہو جاتی ہے۔''میری آواز سنو' کی ابتدا میں وہ لکھتے ہیں

''ممکن ہے کچھ دوست یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ سنگیت اور گانیوالوں کی آوازوں سے الگ کرو تو ان میں کچھ بچتا بھی ہے یا نہیں؟ اگر کچھ دوستوں نے سوچا ہو تو ان سب گیتوں کے بار یمیں نہ سہی کچھ گیتوں کے بارے میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان سے ان کی دھن اور سنگیت الگ کر لی جائے تو گیتوں کے معنی ابھر آئیں گے۔''[۳]

دراصل حقیقت یہ ہے کہ گیت کی معنویت اور اثر پذیری کا بہت کچھ تعلق گیت کے بول اور مضامین کے علاوہ اس منظر نامے اور کہانی کی situation پر ہے جہاں وہ گیت فلمایا گیا ہو۔اس کی موسیقی نیز گلوکار کی آواز کی بھی اپنی جداگانہ اہمیت ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ کیفی کے اکثر فلمی نغمے اپنی اثر پذیری یا تاثر کے سبب سے سنگیت اور آواز کے محتاج بھی نہیں ہیں۔یوں بھی ایسے گیت ہمیشہ اور ہر حال میں سدابہار ہی رہتے ہیں اور دلوں میں گھر کرتے ہیں۔

آیئے اب ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے کیفی کو فلمی دنیا کی طرف راغب کیا۔کیفی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن ہو چکے تھے۔اور پارٹی کے گونا گوں تقاضوں میں اپنے آپ کو مصروف عمل رکھے ہوئے تھے۔پھر کیا وجہ تھی کہ وہ فلمی دنیا کی طرف متوجہ ہوئے۔دراصل آزادی ے بعد ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں اور خصوصاً نوجوان شاعروں مثلاً جاں نثار، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری اور مجاز وغیرہ بمبئی پہنچے۔جہاں مزدوروں اور محنت کشوں کا ایک بڑا طبقہ استحصال و ناانصافی کا شکار تھا۔اس کے علاوہ بمبئی جیسے شہر میں روزی روٹی کے مواقع بھی میسر و موجود تھے۔

چنانچہ جس وقت کیفی نے بمبئی کی طرف رخ کیا، ان کی آمدنی کا کوئی مستقل اور خاطر خواہ ذریعہ تھا ہی نہیں۔پارٹی میں شریک ہوئے تو انہیں پارٹی کی طرف سے صرف پینتالیس روپے ماہانہ ملتے تھے۔کیفی کی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کے سامنے یہ مختصر سی آمدنی ان کے لیے ناکافی تھی۔شادی ہو جانے کے بعد اخراجات میں مزید اضافہ ہوا۔لہٰذا کیفی نے ایک یومیہ اخبار میں روزآنہ پانچ روپے

پر ایک مزاحیہ نظم لکھنا شروع کیا۔ یہ بھی ناکافی ہوا تو کچھ عرصہ کے بعد بیوی نے بھی کام کرنا شروع کیا۔ ان کی بیوی شوکت کی تعلیم تو صرف میٹرک ہی تک تھی۔ لیکن انہوں نے کیفی کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر ان کا ہر طریقے سے ساتھ دیا۔ اور جس کام کو بھی اپنایا اسے بخوبی انجام دیا۔ اول تو انہوں نے انڈین پیوپلز تھیٹر میں کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد ریڈیائی ڈراموں میں بھی حصہ لیا۔ کبھی کبھی کسی فلم کی ڈبنگ بھی مل جاتی۔ شوکت کیفی کے بقول:

''کیفی کی پارٹی سے آمدنی صرف پینتالیس روپے تھی جس میں تیس روپے کھانے کے کٹ جاتے تھے۔ باقی رہے پندرہ روپے، تو اس میں سگریٹ اور ریلوے پاس کا خرچہ میرے پہ کوئی پیسہ نہ بچتا۔ پارٹی تنخواہ مجھے نہیں مل سکتی تھی۔ مجھے پالنے کے لیے کیفی نے ایک ڈیلی نیوز پیپر میں پانچ روپے روز پر ایک مزاحیہ نظم لکھنی شروع کی۔ کبھی کبھی تو مجھے ان پر رحم آنے لگتا۔ آنکھ کھلتے ہی انہیں یہ گھبراہٹ ہوتی کہ نظم لکھنی ہے۔ اور فوراً کاپی پینسل لیکر بیٹھ جاتے۔''[۴]

شبانہ اعظمی کی پیدائش کے بعد کیفی کے اخراجات میں اور اضافہ ہوا۔ دوا علاج، تعلیم و تربیت وغیرہ کے لیے مزید آمدنی کی فکر لاحق ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کیفی کو آہستہ آہستہ فلموں میں کام ملنے لگا۔ یہیں کیفی اعظمی کی فلموں سے وابستگی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے ۱۹۵۱ء میں اپنی فلم ''بزدل'' کے لیے شاہد لطیف نے کیفی سے دوگانے لکھنے کی گزارش کی۔ کیفی نے دو گیت لکھے جو حسب ذیل ہیں:

روتے روتے گزر گئی رات رے

آئی یاد تری ہر بات رے

نیند بھی مری نا میری ہو سکی
رو کے شبنم بھی نہ یہ غم دھو سکی
تھی میں تری پر نہ تیری ہو سکی
روتے روتے گزر گئی رات رے

خواب کی دنیا اجڑ کر رہ گئی
چھین لی سورج نے گھر کی روشنی
چاند سے دور ہوتی ہے اب چاندنی
روتے روتے گزر گئی رات رے

پیار کی گھڑیاں بہت یاد آئیں گی
یاد آ کر رات دن تڑپائیں گی
تم کو یہ تنہائیاں ڈس جائیں گی
روتے روتے گزر گئی رات رے

کاہے اب رے بلم
دھیرے دھیرے تیرا غم
ڈھائے دل پہ ستم
کاہے اب رے بلم
تو لاکھ ستا تو لاکھ رلا
الفت کا مٹنا مشکل ہے
قدموں پہ ترے جو ڈال دیا

اس دل کا اٹھانا مشکل ہے
کیسے باز آئیں گے ہم
دھیرے دھیرے ڈھائے دل پہ ستم
کاہے اب رے بلم

اس کے بعد کیفی نے گرودت کی فلم ''کاغذ کے پھول'' کے لیے گانا لکھا جو بہت ہی مشہور ہوا۔ موہن سہگل کی فلم ''اپنا ہاتھ جگن ناتھ'' اور گرودت کی فلم ''کاغذ کے پھول'' کے جو گانے لکھے وہ بہت مقبول ہوئے۔ بزدل کے بعد بہت سی فلمیں آئیں۔ کاغذ کے پھول تو بہت بعد میں آئی۔ کیفی کی فلمی شاعری کو مستحکم اور مقبول بنانے میں گویا سنگ میل ثابت ہوئے۔ یہاں پہ گانے آج بھی گانے سدا بہار رہے اور ان کی دلکشی باقی ہے۔ مذکورہ گیتوں کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ گا۔

وقت نے کیا کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم

بیقرار دل اس طرح ملے
جسطرح کبھی ہم جدا نہ تھے
تم بھی کھو گئے ہم بھی کھو گئے
ایک راہ پر چل کے دو قدم
وقت نے کیا۔۔۔۔۔

جائیں گے کہاں، سوجھتا نہیں
چل پڑے مگر راستہ نہیں
کیا تلاش ہے کچھ پتہ نہیں
بُن رہے ہیں دل خواب دم بہ دم
وقت نے کیا۔۔۔۔۔

(کاغذ کے پھول)

اپنے ہاتھوں کو پہچان
مورکھ ان میں ہے بھگوان
مجھ پر تجھ پر سبھی پر
ان دونوں ہاتھوں کا احسان
اپنے ہاتھوں کو پہچان
ہاتھ اٹھاتے ہیں جو کدال پربت کاٹ گراتے ہیں
جنگل سے کھیتی کی طرف موڑ کے دریا لاتے ہیں
چٹکی بھر دانے لیکی وہ جو زمیں میں پر بکھرائے
جتنے تارے چمکتے ہیں اتنے ہی پودے اگائے
بھوک جہاں تک دیکھ سکے کھیت وہاں تک لہرائے
چونے گارے اینٹوں سے ہے ہاتھوں کا ہے یارانہ
رکھے نیو سے جب چھت کو گگن دے نزرانہ
بستا جائے شہر نیا سجت جائے ویرانا

اپنے ہاتھوں کو پہچان
چھینی اور ہتھوڑے کا کھیل اگر یہ دکھلائیں
ابھرے چہرے پتھر پہ دیو دیوتا مسکائیں
چمکے چمکے تاج محل
آنکھ چھپکتے لگ جائے میلا کورے برتن کا
ہاتھ چھو لینے سے سونا بنتا ہے زیور
روپ کو چمکا دیتے ہیں کنگن جھمکے اور جھومر
بین سرنگ طبلہ ڈھولک سب کچھ ہاتھ بجاتے ہیں
تاروں میں آواز کہاں ہاتھ تمہارے گاتے ہیں

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے
اب نہ وہ پیار نہ اس پیار کی یادیں باقی
آگ یوں دل میں لگی کچھ نہ رہا کچھ نہ بچا
جس کی تصویر نگاہوں میں لیے بیٹی ہو
میں وہ دلدار نہیں اسکی ہوں خاموش چتا
جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
زندگی ہنس کے گزرتی تو بہت اچھا تھا
خیر ہنس کے سہی رو کے گزر جائے گی

راکھ برباد محبت کی بچا رکھی ہے
بار بار اس کو جو چھیڑا تو بکھر جائے گی
جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
آرزو جرم، وفا جرم، تمنا ہے گناہ
یہ وہ دنیا ہے جہاں پیار نہیں ہو سکتا
کیسے بازار کا دستور تجھے سمجھاؤں
بک گیا جو وہ خریدار نہیں ہو سکتا
جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں

فلمی دنیا میں کیفی نے گیت تو بے شمار لکھے ہیں لیکن سب کا حوالہ محض حوالہ بن کر نہ رہ جائے۔ چند مثالیں ہی دی جائیں گی تاکہ مختلف نوعیت کے گیتوں کا اندازہ ہو سکے۔

کیفی نے فلمی گانوں کے ساتھ ساتھ فلموں کے لیے مقالمے، اسکرین پلے اور اسکرپٹ وغیرہ بھی تحریر کیے۔ ''ہیر رانجھا''، فلم جو شروع سے آخر تک منظوم ہے۔ اس فلم کو منظوم کرنے کا بھی بھاری پتھر کوئی بھی اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن کیفی نے اس چیلینج کو قبول کیا۔ اور قبول ہی نہیں کیا بلکہ کامیاب طریقے سے مکمل کیا۔ یہ فلم نہایت مقبول ہوئی۔ اس کے مقالمے اور نغمے آج بھی ذہن و دل کا حصہ ہیں۔ مثلاً اس طرح کے نغمے:

یہ دنیا، یہ محفل مرے کام کی نہیں
کس کو سناؤں حال دلِ بے قرار کا
بجھتا ہوا چراغ ہوں اپنے مزار کا
اے کاش بھول جاؤں مگر بھولتا نہیں
کس دھوم سے اٹھا تھا جنازہ بہار کا
یہ دنیا کہ محفل مرے کام کی نہیں

اپنا پتہ ملے نہ خبر یار کی ملے
دشمن کو بھی نہ ایسی سزا پیار کی ملے
ان کو خدا ملے، ہے خدا کی جنہیں تلاش
مجھ کو بس اک جھلک مرے دلدار کی ملے
یہ دنیا کہ محفل مرے کام کی نہیں

صحرا میں آ کے بھی مجھ کو ٹھکانہ نہ ملا
غم کو بھلانے کا کوئی بہانہ نا ملا
دل ترسے جس میں پیار کو کیا سمجھوں اس سنسار کو
اک جیتی بازی ہار کے میں ڈھونڈوں بچھڑے یار کو
یہ دنیا کہ محفل مرے کام کی نہیں

دور نگاہوں سے آنسو بہاتا ہے کوئی
کیسے نہ جاؤں میں مجھ کو بلاتا ہے کوئی
یا ٹوٹے دل کو جوڑ دو یا سارے بندھن توڑ دو
اے پربت رستہ دے مجھے اے کانٹو دامن چھوڑ دو
یہ دنیا یہ محفل مرے کام کی نہیں۔

اسی طرح سے فلم ''گرم ہوا'' ہے۔جس کی کہانی مکالمہ اوراسکرین پلے کیفی کا لکھا ہوا ہے۔ان مجموعی خدمات کئے عوض کیفی کو فلم فیئر کے تین ایوارڈز سے نوازا گیا۔ایک کہانی کا دوسرا ڈائلاگ اور تیسرا اسکرین پلے کا۔اس کہانی کے لیے انہیں نیشنل ایوارڈ بھی دیا گیا۔

''گرم ہوا'' ایسی پہلی فلم ہے جس میں نہایت جرئت مندی سے ملک کی تقسیم کی اور تقسیم سے پیدا شدہ سیاسی حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔آزادی حاصل ہونے کیبعد دونوں ملکوں کو پیش آنے والے دردانگیز اور قابل توجہ نتائج کو بہت ہی حقیقت پسندی اور دلدوز طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح جب غالب کی تقریبات کا سلسلہ چلا تو غالب کے متعلق ستھیون نے ایک مختصر فلم تیار کی۔یہ مختصر دستاویزی اور تاریخی حیثیت کی حامل فلم کیفی صاحب ہی کی لکھی ہوئی ہے۔اس میں آواز بھی انہیں کی ہے۔غالب سے متعلق اس مکمل فلم کا افتتاح ''ڈاکٹر ذاکر حسین'' کے ہاتھوں ہوا تھا۔اس فلم کے متعلق محمد مہدی فرماتے ہیں؛

SMT. HANSA MEHTA LIBRARY
M.S. University of Baroda

''اب تو سنا ہے کہ ایک مشہور ڈائریکٹر کیفی سے غالب کی اسکرپٹ بھی لے گئے اور اعلان کر دیا کہ اسکرپٹ کھو گئی۔ کیفی کو غالب سے اتنا لگاؤ ہے اور اس فلم میں وہ اس قدر الجھے ہوئے تھے اس کا اندازہ ان کے کچھ خطوں سے ہو سکتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر خط میرے نام ہیں اور کچھ میری بیوی کے نام۔ وہ فلم تو نہ بن سکی لیکن اس کی یاد دلوں میں اب بھی باقی ہے۔''[۵]

ایک عام خیال یہ ہے کہ فلمی گیتوں میں نغمہ نگار ادبی معیار قائم رکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ بات نغمہ نگار اور ان کے کچھ گیتوں سے متعلق تو کہی جا سکتی ہے لیکن ترقی پسند شاعروں کے ذریعے لکھے گئے گیتوں کا تعلق ہے تو ایسے شاعروں نے فلمی گیتوں میں کافی حد تک ادبی معیار کی پابندی کی ہے۔ اس کے سبب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلمی گیتوں کا مزاج اور آہنگ ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد سے کافی حد تک مماثلت رکھتا تھا۔ وہ اپنے مقصد کی تسکین اور حل کیلیے فلمی کہانیوں اور اس کے ذریعے گیتوں کے حوالے سے اپنے نسب العین کی تسکین بہ آسانی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایسے شعراء جنھوں نے فلمی گیتوں کے حوالے سے ترقی پسند تحریک کے پیغامات کو عوام تک پہنچایا اور اس میں ادبی معیار بھی برقرار رکھا، چند نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر، شیلیندر، کیفی اعظمی خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن شکیل بدایونی کی ادبیت کو بھی نذر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں بھی اہمیت کے لحاظ سے ساحر کو تفوق حاصل ہے کہ ساحر نے اپنے نغموں کے ذریعے ادب اور ترقی پسند نظریات کی آمیز کر کے گیتوں کو اعتبار و معیار عطا کیا ہے۔ لہذا غور کریں تو ان کے نغموں کا معتد بہ حصہ ان اوصاف سے مملو ہے۔ لہذا

انہوں نے بہ جا طور پر فلمی نغموں کو ایک علاحدہ صنف کی حیثیت بھی دے دی ہے۔ جب کہ فلمی نغمے مختلف پابندیوں کے زیر اثر لکھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی کمال حاصل کر لینا فکری رفعت کا ثبوت ہے۔ اپنے گیتوں کا مجموعہ ''گاتا جائے بنجارا'' میں لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ ان تمام پابندیوں کیساتھ جو شعری ادب ظہور میں آئے گا وہ ان فلمی بلندیوں کو نہیں چھو سکے گا جو ادب عالیہ کا حصہ ہے۔ پھر بھی اس صنف کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اپنا ایک دائرہ ہے۔ جو کتب و رسائل، ریڈیو اور تھیٹر سب سے وسیع ہے۔''[٦]

جیسا کہ اس قبل عرض کیا گیا کہ فلمی گیتوں میں ادبی معیار برقرار رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کیوں کہ نغمہ نگار کو کئی شرائط اور پابندیوں کے درمیان گیت کمپوز کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ ادبیت سنجیدگی اور ٹھراؤ کی متقاضی ہوتی ہے، اور ہر گیت یا گیت کا ہر شعر اس کا متحمل نہیں ہوتا کہ ادبیت کی قیمت پر منظر اور کہانی کو قربان کر دیا جائے لیکن دیگر ترقی پسند شاعروں کیساتھ ساتھ کیفی نے بھی حت الامکان اپنے گیتوں میں ادبیت کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں محمد ذاکر تحریر فرماتے ہیں:

''ترقی پسندوں نے فلمی گیتوں میں بھی شعریت اور ادبی معیار کا خیال رکھا ہے۔ انہیں تخلیقات کے پیش نظر اب فلکی گیت کو محض کیک تک بندی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ انہوں نے فلمی گیت کو حسن بیان بھی بخشا ہے اور تخیل کی لطافت اور جذبت کی پاکیزگی بھی۔ ان کے اکثر گیت اس دور کی اردو شاعری میں ایک نمایاں

اضافہ ہیں۔(ان میں سے کچھ گیت کتابی صورت میں بھی شایع ہوگئے ہیں'' ۷

فلمی شاعر بھی چونکہ ایسی چلتی پھرتی دنیا اور جیتے جاگتے سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔اس کی زندگی کے بھی گونو گوں تقاضے ہوتے ہیں۔اس کے سامنے بھی روزی روٹی کا مسئلہ ہوتا ہے۔چونکہ فلمی گیت بہت طویل بھی نہیں ہوتے۔اس کے علاوہ دیگر اصناف سخن کی تخلیق میں لازمی شرائط کی پابندی بھی گیت میں ضروری یا لازمی نہیں ہوتی اور اس کے عوض اچھی خاصی رقم معاوضہ میں مل جاتی ہے۔تاہم اکثر ترقی پسند شعراء نے محض معاوضہ کے لیے نغمے نہیں لکھے بلکہ اپنی فنکارانہ صلاحیت سے فلمید نیا کینئے نئے گیتوں سے فلمی دنیا کو مالا مال بھی کیا۔بقول ڈاکٹر اجمل اجملی ذیل میں فرماتے ہیں:

''فلمی گیتوں نے ترقی پسند خیالات کو عام کرنے اور محنت کش عوام کو جدو جہد پر ابھارنے کے سلسلے میں زبردست رول ادا کیا ہے۔یہ بات پوری وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے بھی مقاصد کی تبلیغ کے لیے فلم کے امکانات سے پوری طرح استفادہ کیا۔اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اہم اہم ترقی پسند شعراء نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی اس طرف توجہ دی۔پاکستان میں ہمایت علی شاعر،حبیب جالب اور خود فیض احمد فیض نے ایسے گیت لکھے ہیں جن میں ترقی پسند گیتوں کی ساری روایت موجود ہیں۔'' ۸

کیفی اعظمی نے فلموں کیلیے جو گیت لکھے اگر انہیں فلم کے پردے سے ہٹ کر دیگر ذریعے سے سنایا پڑھا جائے تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ فلمی منظر یا دھنوں کی پابندی کرتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے

کسی واقعے، تجربے یا حوادث سے دوچار ہونے کے بعد معرض تحریر میں آتے ہیں۔ کیفی کے ایسے گیتوں میں شعریت بھی ہے، ادبیت بھی، گہرائی بھی ہے، سنجیدگی بھی ہے اور وابستگی بھی۔ ایسے گیت جب پردۂ سیمیں پر کسی فلم کے منظر نامے کے تحت گلوکار اور سنگیت کار کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں تو سدا بہار بن جاتے ہیں۔ دوسرے نغمہ نگاروں کی طرح کیفی کے بھی اکثر گیت موسیقی کے دھنوں اور دیگر فلمی تقاضوں کے تحت تبدیلیاں آئی ہیں جو اوزان میں بھی در آئی ہیں اور ہئیت میں بھی۔ کیفی نے فلموں کے لیئے جو گیت لکھے ہیں ان میں غزل نما گیتوں کے علاوہ نظم کی ہئیت کے گیت بھی شامل ہیں۔ زنجیدہ فلموں میں غزل نماں یگیت زیادہ ہیں۔ اسکے علاوہ کیفی کی اکثر نظمیں جزوی تبدیلی کے ساتھ فلموں میں لی گئی ہیں۔

کیفی نے فلمی کہانی اور مناظر کی نوعیت کے لحاظ سے رومانی گیت بھی لکھے اور سیاسی بھی اور انقلابی نوعیت کے بھی۔ لیکن کیفی کا امتیاز یہ ہے کہ انہیں اکثر حب الوطن پر مبنی گیت لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ کیوں کہ کیفی فطری طور پر آزادئ وطن اور حب الوطنی کے جذبے سے ہمیشہ سرشار رہے ہیں۔ انہیں اپنے مادر وطن سے عشق کی حد تک لگاؤ رہا ہے۔ اس سلسلے میں سبودھ لال کا خیال خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

''کیفی کو اکثر ایسی فلموں کے گیت لکھنے کو کہا گیا جہاں دیس بھکتی کا جزبہ کہانی کا اہم حصہ ہو۔ مثلاً حقیقت، ہندوستان کی قسم، نونہال اور دیگر فلموں میں کیفی میں جو دیس بھکتی کے گیت لکھے ہیں وہ فلمی شاعری میں اس قسم کے بہترین گیتوں میں شامل

ہیں۔"۹

مثال کے طور پر فلم حقیقت کا گیت "کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیوں، اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو"۔ اس پورے گیت میں ایک ایک لفظ سے وطن کی محبت ٹپکتی ہے۔ ایک ایک حصہ اور شعر حب الوطنی کے شدید اور مخلصانہ جذنے سے سرشار ہے۔ وطن کی فلاح، حفاظت اور جان تک کی قربانی کا شدید جذبہ اور احساس اس پورے گیت میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ کیفی کا یہ گیت ہندوستان میں یوم جمہوریہ اور یوم آزادی کے ایام میں پابندی سے بجایا اور سنایا جاتا ہے۔ اور وہ گیت یہ ہے:

کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو
سانس تھمتی گئی نبض جمتی گئی
پھر بھی بڑھتے قدم کو نہ رکنے دیا
کٹ گئےسر ہمرے تو کچھ غم نہیں
سر ہمالہ کا ہم نے نہ جھکنے دیا
مرتے مرتے رہا بانکپن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو
زندہ رہنے کے موسم بہت ہیں مگر
جان دینے کی رت روز آتی نہیں
حسن اور عشق دونوں کو رسوا کرے

وہ جوانی جو خوں میں نہاتی نہیں
آج دھرتی بنی ہے دلہن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو
راہ قربانیوں کی نہ ویران ہو
تم سجاتے ہی رہنا نئے قافلے
فتح کا جشن اس جشن کے بعد ہے
زندگی موت سے مل رہی ہے گلے
باندلو اپنے سر سے کفن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو
کھینچ دو اپنے خون سے زمیں پر لکیر
اس طرف آنے پائے نہ راون کوئی
توڑ دو ہاتھ اگر ہاتھ اٹھنے لگیں
چھو نہ پائے سیتا کا دامن کوئی
رام بھی تم، تمہی لکشمن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو

اس طرح وطن سے محبت اور اس کے رہنماؤں سے سچیا ور والہانہ عقیدت محبت کا جذبہ کیفی کے کئی اور گیتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً ملک کے پہلے وزیر اعظم اور سچے وطن پرست ہر دلعزیز رہنما پنڈت جواہر لال نہرو سے کیفی کہ

دلی محبت تھی۔ نہرو کی وفات پر مختلف شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر خراج عقیدت پیش کیا۔ کیفی کے پاس فلمی گیت کا از بردست اور موثر وسیلہ موجود تھا۔ ایسے میں جب انہیں فلم نونہال میں گیت لکھنے کا موقع ملا تو یہ گیت لکھا:

میری آواز سنو، پیار کا راز سنو
میں نے اک پھول جو سینے پہ سجا رکھا تھا
اس کے پردے میں تمہیں دل سے سجا رکھا تھا
تھا جدا سب سے سے مرے عشق کا انداز سنو
میری آواز سنو، پیار کا راز سنو
زندگی بھر مجھے نفرت سی رہی اشکوں سے
میرے خوابوں کو تم اشکوں میں ڈبوتے کیوں ہو
جو مری طرح جیا کرتے ہیں کب مرتے ہیں
تھک گیا ہوں مجھے سو لینے دو روتے کیوں ہو
سو کے بھی جاگتے رہتے ہیں ضان باز سنو
میری آواز سنو، پیار کا راز سنو
میری دنیا میں نہ پورب ہے نہ پچھم کوئی
سارے انسان سمٹ آئے کھلی بانہوں میں
کل بھٹکتا تھا میں جن راہوں میں تنہا تنہا
قافلے کتنے ملے آج انہیں راہوں میں
اور سب نکلے مرے ہم دم و ہمراز سنو

میری آواز سنو، پیار کا راز سنو

نہ نہال آتے ہیں ارتھیکو کنارے کولو
میں جہاں تھا، انہیں جانا ہے وہاں سے آگے
آسمان ان کا زمیں ان کی زمانہ ان کا
ہے کئی ان کے جہاں میرے جہاں سے آگے
انہیں کلیاں نہ کہو یہ ہیں چمن ساز سنو
میری آواز سنو، پیار کا راز سنو
کیوں سنواری ہے یہ چندن کی چتا میرے لیے
میں کوئی جسم نہیں ہوں کو جلاؤ گے مجھے
راکھ کے ساتھ بکھر جاؤں گا میں دنیا میں
تم جہاں کھاؤ گے ٹھا کرو ہیں پاؤ گے مجھے
ہر قدم پر ہے نئے موڑ کا آآز سنو
میری آواز سنو، پیار کا راز سنو

اس نظم کے پہلے بند میں ''میں نے اک پھول جو سینے سے لگا رکھا تھا'' نہرو کی گلاب دوستی کی طرف اشارہ ہے۔ جو ان کی شیروانی میں اوپر کی طرف بائیں طرف (دل کے اوپر) ہمیشہ لگا س رہتا تھا۔ اور دوسر مصرع ''اس کے پردے میں تمہیں دل سے لگا رکھا تھا''۔ کا امطلب ہندوستان سے دلی محبت کی طرف

اشارہ ہے۔اسی طرح س گیت کے ہر بند میں فلمی کہانی کے سو یلے سے مادر وطن سے سچی محبت اور عقیدت کے جذبات نمایاں ہیں۔ فلمی دنیا میں یہ کمال بہت کم شاعروں کے حصہ میں آیا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ کیفی نے سیاسی رنگ میں گیت لکھے ہیں۔خصوصاً خود ساختہ، مطلب پرست، خودغرض اور ملک وسماج اور عوامی دشمن رہنماؤں کے کالے کرتوتوں کو ظاہر کرتے ہوئے ایک گیت لکھا۔

ہاتھوں میں کچھ نوٹ لو، پھر چاہے جتنے ووٹ لو
کھوٹے سے کھوٹا کام کرو، باپو کو نیلام کرو
باپو باپو کرتے رہو، زہر دلوں میں بھرتے رہو
پرانت پرانت کو تنگ کرے، بھاشا سے بھاشا جنگ کرے
سب کو چاہئے اپنی زمیں، ہندوستانی کوئی نہیں

وطن پرستی کے علاوہ کیفی کی پیغام انسان دوستی اور آدمیت بھی رہا ہے ۔ترقی پسند تحریک کے مقاصد کے تحت عالمی برادری اور اخوت کے علمبردار ہمیشہ رہے ہیں۔وہ کائنات کو ایک کنبہ اور اس کے افراد کو ایک ہی کنبے کے افراد تصور کرتے ہیں۔ان کے دکھی ہونے پر وہ دکھی اور خوش ہونے پر وہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اس طرح پیش کیا ہے۔

مبتلائے درد ہو کوئی عضو روتی ہے آنکھ

کسقدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

کیفی نے سیاسی، سماجی اور انسانی زندگی کے اقتصادی، معاشرتی وغیرہ مسائل کو بھی اپنے گیتوں میں موقع ملتے ہی جگہ دی ہے۔ فلم ''کاغذ کے پھول'' کے ایک گیت میں ان کے یہ خیالات وجذبات دیکھیے:

دیکھی زمانے کی یاری، بچھڑے سبھی باری باری
کی لے کے ملیں اب دنیا سے
آنسو کے سوا اس کچھ پاس نہیں
یا پھول ہی پھول تھے دامن میں
یا کانٹوں کی بھی آس نہیں
مطلب کی دنیا ہے ساری۔ بچھڑے سبھی باری باری
وقت ہے مہربان، آرزو ہے جواں
فکر کل کی کریں، اتنی فرصت کہاں
دور یہ چلتا رہے.
روپ مچلتا رہے
رنگ اچھلتا رہے
جام بدلتا رہے
رات بھر مہرباں ہیں بہاریں یہاں
رت گر ڈھل گئی پھر یہ خوشیاں کہاں
پل بھر کی خوشیاں ساری

بڑھنے لگی بیقراری، بچھڑے سبھی باری باری
اڑ جا، اڑ جا، پیاسے بھنورے
رس نہ ملے گ خاروں میں
کاغذ کے پھول جہاں کھلتے ہیں
بیٹھ نہ ان گلزاروں میں
نادان تمنا ریتی میں
امید کی کشتی کھیتی ہے
اک ہاتھ سے دیتی ہے دنیا
سو ہاتھوں سے لے لیتی ہے
یہ کھیل ہے کب سے جاری، بچھڑے سبھی باری باری

انسانی سماج میں رشتے بنتے اور ٹوٹتے ہیں سنورتے بھی ہیں اور بگڑتے بھی ہیں اور بکھرتے بھی ہیں، ہزار کوشش اور احتیط کے باوجود گردش زمانہ کی زد میں آ کر پرخلوص اور بے لوث رشتے بھی جدائی اور فرقت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔محبوب اور عاشق دونوں میں سے کوئی قصوروار اور ذمہ دار نظر نہیں آتا۔ایسے کش مکش کے حالات میں سوائے حالات سے سمجھوتا کئے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا۔

ایسی ہی نوعیت کی کشمکش کو کیفی نے ''کاغذ کے پھول'' فلم کا یہ گیت نہایت ہی موثر طریقے سے پیش کیا ہے:

وقت نے کیا کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم

بیقرار دل اس طرح ملے
جس طرح کبھی ہم جدا نہ تھے
تم بھی کھو گئے ہم بھی کھو گئے
ایک راہ پر چل کے دو قدم
وقت نے کیا کیا حسیں ستم
جائیں گے کہاں سوجھتا نہیں
چل پڑے مگر راستہ نہیں
کیا تلاش ہے کچھ پتہ نہیں
بن رہے ہیں دل خواب دم بہ دم
وقت نے کیا کیا حسیں ستم

جیسا کہ کیفی اعظمی کی رومانی شاعری کے باب میں کیفی شاعری میں رومانی اور جمالیاتی عناصر کو واضح کیا گیا ہے۔ کیفی کی طبیعت میں ابتدا ہی سے رومان اور جمالیات سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ صنف نازک کے لطیف و نازک جذبات و احساسات کی بڑے موثر اور دل پذیر طریقے سے تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہندوستانی سماج میں عورت کے جذبات و خیالات کی سچی اور فطری ترجمانی کرنے میں کیفی کا کمال عروج پر آتا ہے۔ ایک دو گیتوں کے حوالے سے کیفی کی یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ فلم ہیر رانجھا کے گیت کے بول ہیں:

ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں

ملوتو آنکھ چرائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
تمہیں کو دل کا راز بتائیں
تمہی سے راز چھپائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
او بھولے ساتھیا
دیکھی جو شوخی تیرے پیار کی
آنچل میں بھر لی ہم نے
ساری بہاریں سنسار کی
نئی ادا سے ہم اترائیں
پائی خوشی لٹائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
روٹھے کبھی کبھی مان گئے
گھاتیں تمہاری ہم جان گئے
ایسی ادائیں قربان گئے
روٹھے کبھی کبھی مان گئے
تمہیں منائیں
دل بہلائیں
کیا کیا ناز اٹھائیں

ہمیں کیا ہو گیا ہے،
او سونے جو گیا رنگ لے ہمیں بھی اسی رنگ میں
پھر سے سنا دے بنسی، کلیاں کھلا دے گورے انگ میں
وہی جو تانیں آگ لگائیں
انہیں سے آگ بجھائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
ہمیں کیا ہو گیا ہے،
ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں
ملو تو آنکھ چرائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے،

(ہیر رانجھا)

اسی طرح فلم انو پما کے ایک مشہور و معروف گیت دیکھئے:
دھیرے دھیرے مچل اے دل بیقرار کوئی آتا ہے
یوں تڑپ کے نہ تڑپا مجھے بار بار کوئی آتا ہے
اس کے دامن کی خوشبو ہواؤں میں ہے
اس کے قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
مجھ کو کرنے دے کرنے دے سولہ سنگار
کوئی آتا ہے۔۔۔۔۔
مجھ کو چھونے لگی اس کی پرچھائیاں

دل کے نزدیک بجتی ہیں شہنائیاں
میرے سپنوں کے آنگن میں گاتا ہے پیار
کوئی آتا ہے۔۔۔۔۔
روٹھ کر پہلے جی بھر ستاؤں گی میں
جب منائیں گے وہ مان جاؤں گی میں
دل پہ رہتا ہے ایسے میں کب اختیار
کوئی آتا ہے۔۔۔۔۔

(انوپما)

اپنے گیتوں میں نسوانی جذبات کی بھرپور عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ کیفی نے عاشق کے جذبات واحساسات کی بڑی سچی اور فطری عکاسی کی ہے۔ کیوں کہ فلمی کہانیوں میں جہاں معشوقہ یا عورت مرد کی بے توجہی اور بے وفائی کا شکار بتائی جاتی ہے وہیں مرد کیساتھ بھی کہانی کی نوعیت وتقاضے کے تحت اس کی معشوقہ کی طرف سے بے رخی، ظلم وستم اور عدم توجہی برتی جاتی ہے۔ عشق میں ناکامی ، زمانے کا ظلم ستم، رسم ورواج کی قید وبند حالات کے تقاضے کے تحت اپنے اندرونی جذبات کو چھپانا یا دبانا وغیرہ عشقیہ جذبات کی ترجمانی بھی کیفی اعظمی نے بڑے ہی موثر انداز سے کی ہے۔ ان کا تحریر کردہ یہ نغمہ سماجی بندشوں کے زیر اثر لکھا گیا ہے۔

یہ دنیا، یہ محفل میرے کام کی نہیں
کس کو سناؤں حال دل بیقرار کا
بجھتا ہوا چراغ ہوں اپنے مزار کا

اے کاش بھول جاؤں مگر بھولتا نہیں
کس دھوم سے اٹھا تھا جنازہ بہار کا
یہ دنیا، یہ محفل میرے کام کی نہیں

اپنا پتہ ملے نہ خبر یار کی ملے
دشمن کو بھی نہ ایسی سزا پیار کی ملے
ان کو خدا ملے ہے خدا کی جنہیں تلاش
مجھ کو بس اک جھلک مرے دلدار کی ملے
یہ دنیا، یہ محفل۔۔۔۔۔

صحرا میں آ کے بھی مجھ کو ٹھکانا نہ ملا
غم کو بھلانے کا کوئی بہانہ نا ملا
دل ترسے جس میں پیار کو، کیا سمجھوں اس سنسار کو
اک جیتی بازی ہار کے میں ڈھونڈوں بچھڑے یار کو
یہ دنیا، یہ محفل۔۔۔۔۔

دور نگاہوں سے آنسو بہاتا ہے کوئی
کیسے نہ جاؤں میں مجھ کو بلاتا ہے کوئی
یا ٹوٹے دل کو جوڑ دو، یا سارے بندھن توڑ دو
اے پربت رستہ دے مجھے، اے کانٹوں دامن چھوڑ دو
یہ دنیا، یہ محفل۔۔۔۔۔

(ہیر رانجھا)

کیفی کے اس گیت میں زمانے اور سماج کا خوف نمایاں ہے۔ گیت اس طرح ہے:

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو
کیا غم ہے جسکو چھپا رہے ہو
تم اتنا۔۔۔
آنکھوں میں نمی ہنسی لبوں پر
کیا حال ہے کیا دکھا رہے ہو
کیا غم ہے۔۔۔۔
بن جائیں گے زہر پیتے پیتے
یہ اشک جو پیتے جا رہے ہو
کیا غم ہے۔۔۔۔
جن زخموں کو وقت بھر چلا ہے
تم کیوں انہیں چھیڑے جا رہے ہو
کیا غم ہے۔۔۔۔
ریکھاؤں کا کھیل ہے مقدر
ریکھاؤں سے مات کھا رہے ہو
کیا غم ہے۔۔۔۔۔

اسی طرح فلم ''ہنستے زخم'' کے مندرجہ ذیل غیر مردف غزل میں بھی

سماجی قید و بند اور رسم و رواج کی بندشوں کی نقشہ کیفی نے نہایت ہی دلچسپ طریقے سے کھینچا ہے۔

آج سوچا تو آنسو بھر آئے
مدتیں ہو گئیں مسکرائے
ہر قدم پر ادھر مڑ کے دیکھا
ان کی محفل سے ہم اٹھ تو آئے
رہ گئی زندگی درد بن کے
درد دل میں چھپائے چھپائے
دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہیں
یاد اتنا بھی کوئی نہ آئے

(ہنستے زخم)

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ ترقی پسند شاعروں کے ساتھ کیفی نے بھی اپنے گیتوں میں ادبی معیار کو برقرار رکھا ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے زبان و بیان کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ ان گیتوں میں کیفی نے بھرپور کوشش کی ہے کہ جدید فلمی گیتوں کی گندگی اور بے ادبی دور رہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان گیتوں میں ایک قسم کی سنجیدگی، ٹھہراؤ، اور زندگی کی حقیقت بیانی پائی جاتی ہے۔ ایک دو مثالوں سے کیفی کا یہ وصف صاف سمجھ میں آتا ہے۔

جھکی جھکی سی نظر بیقرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں

تو اپنے دل کی جواں دھڑکنوں کو گن کے بتا
مری طرح ترا دل بیقرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں
جھکی جھکی سی نظر۔۔۔۔
وہ پل کہ جس میں محبت جوان ہوتی ہے
اس ایک پل کا تجھے انتظار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں
جھکی جھکی سی نظر۔۔۔۔
تری امید پہ ٹھکرا رہا ہوں دنیا کو
تجھے بھی اپنے پہ یہ اعتبار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں
جھکی جھکی سی نظر۔۔۔۔

(ارتھ)

کیفی کا درج ذیل گیت بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے
اب نہ وہ پیار نہ اس پیار کی یادیں باقی
آگ یوں دل میں لگی کچھ نہ رہا کچھ نہ بچا
جس کی تصویر نگاہوں میں لیے بیٹھی ہو

میں وہ دلدار ہوں اس کی ہوں خاموش چتا

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔۔۔۔۔۔

زندگی ہنس کے گزرتی تو بہت اچھا تھا

خیر ہنس کے نہ سہی رو کے گزر جائے گی

راکھ برباد محبت کی بچا رکھی ہے

بار بار اس کو جو چھیڑا تو بکھر جائے گی

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔۔۔۔۔۔

آرزو جرم وفا جرم تمنا ہے گناہ

یہ وہ دنیا ہے جہاں پیار نہیں ہو سکتا

کیسے بازار کا دستور تجھے سمجھاؤں

بک گیا جو وہ خریدار نہیں ہو سکتا

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔۔۔۔۔۔

ایک وقت میں آئی فلم ''پاکیزہ'' نے کافی شہرت کمائی۔ اس فلم کے ایک گیت کا ذکر یہاں لازمی ہے۔

چلتے چلتے، چلتے چلتے

یوں ہی کوئی مل گیا تھا

سرِ راہ چلتے چلتے

وہیں تھم کے رہ گئی ہے

مری رات ڈھلتے ڈھلتے

جو کہی گئی نہ مجھ سے
وہ زمانہ کہہ رہا ہے
یہ فسانہ بن گئی ہے
مری بات ٹلتے ٹلتے
شب انتظار آخر
کبھی ہو گی مختصر بھی
یہ چراغ بجھ رہے ہیں
مرے ساتھ جلتے جلتے
چلتے چلتے

کیفی اعظمی کے مذکورہ بالا فلمی گیتوں کے تجزئے کے بعد یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ کیفی بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک اور اس کے تقاضوں سے قلبی اور ذہنی طور پر وابستہ تھے۔ کیفی نے جب فلموں میں گیت لکھنا شروع کیا اس تو بہت ہجلد انہیں غیر معمولی مقبولیت حاسل ہوئی۔ لیکن دوسرے فلمی نغمہ نگاروں کی طرح انہوں نے خاطر خواہ فلمی دنیا سے اپنے فن اور کمال کے عوض تجارتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ عزت اور شہرت حاسل کی کیفی کی نظموں اور غزلوں کے بارے میں کئی ہم عصروں نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ کیفی کی شاعری نعرہ بازی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ دراصل فلمی نغمہ نگاری کی طرف رجوع کرنا کیفی صاحب لیئے یہ مجبوری بھی تھی

اور ضرورت بھی۔ پارٹی سے کچھ اس قدر تنخواہ یا خرچ نہیں ملتا تھا کہ ان کی خانگی ضروریات اور دیگر اخراجات پورے ہو سکیں۔ اور ہمارے سماج میں دیگر ملکوں کی طرح روزگاری کی کوئی ضمانیت نہیں ، بے روزگاری میں نہ کوئی سرکاری الاونس کی گنجائش ہے ہنہ عمر کے آخر میں پینشن کی سہولت۔

ان حالات میں کیفی کے لیے فلمی گیت لکھ کر اپنا گزر بسر کرنے کے علاوہ چارہ ہی کی تھا۔ اور پھر بمبئ جیسے شہر میں جہاں قدم قدم پر اخراجات کی فزوی قدم لیتی اور راہیں روکتی ہے، اس کے بغیر نہ کوئی رشتہ استوار ہوتا ہے نہ کوئی تعلق کام آتا ہے۔

ساحر لدھیانوی نے کیفی کے ان حالات کے پیش نظر ایک بار کہا تھا کہ:'' موجودہ سیاسی اور انتظامی نظام کسی کو روزگار کی ضمانت نہیں دیتا ہے ، بیروزگاری کا الاؤنس یا بڑھاپے کا پینشن اور علاج معالجہ کی سہولیت نہیں مہیا کرتا۔۔۔ اگر ایسا سیاسی اور سماجی نظام قائم ہو جاتا تو کیفی کو کومرشیل فلموں میں لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وہ شاعری کرتے ، انسانوں کی، نیچر کی، عشق و محبت کی اور مختلف کیفیات کی، اور وہ سوشلیسٹ سماج کی تعمیر میں ہاتھ بٹاتے کسان اور مزدوروں کے شانہ بشانہ۔''[10]

سبودھ لال کا کہنا ہیکہ:

'' کیفی نے اگر فلموں میں گیت نہ لکھے ہوتے تو بھی ان کی شخصیت قبول ہی رہتی لیکن یقیناً فلمی دنیا اس رس، امن جسن کو ترستی جو کیفی ہی کی دین ہے۔ اگر کیفی نے فلموں کے علاوہ شاعری نہ کی ہوتی تب بھی ان کو ادب عزت کی نظر سے

دیکھتا اور زمانہ ان کی آواز دھیان سے سنتا''[۱۱]

آخر میں مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیفی اعظمی کا فلمی گیتوں کے حوالے سے واضح پیغام محبت و اخوت بھائی چارہ اور خیر سگالی کا پیغام ہے۔ انسایت اور رواداری کا پیغام ہے۔ صلح کا پیغام ہے۔ اور یہی پیغام مختلف عنوانات کے تحت مختلف زاویوں اور پیرائے میں ان کی تمام تر عاعری خواہ وہ نظم ہو یا غزل، فلمی گیت ہو یا دیگر منظومات سبھی میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

کیفی کے فلمی گیتوں میں عام طور پر تین طرح کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ اول تو اپنے عہد کے سیاسی، سماجی تقاضے، ان کی بر پور عکاسی جس میں ملک کی آزادی، اس کی سلیت اور بقا اور اس کے اپنے پر خلوص؛ جذبات کا اظہار۔

دوسرا رنگ یہی ہے کہ وہ عوام میں ناانصافی، ظلم ستم حق تلفی اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے جذبۂ انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ہر محاظ پر اپنی صلاحیتوں اور فن سے کام لیا۔

کیفی کی شاعری کا تیسرا محرک اور غالب عنصر عشق و محبت کا جذبہ اور رومانا و جمالیات کا بیان ہے۔ اس جذبے کا اظہار بھی انہوں نے اپنے دونوں مذکورہ بالا مقاصد کے لیے ہی کیا۔ کیفی اعظمی کے گیتوں کی یہ خصوصیت ان کے نغموں کے تجزیاتی مطالعہ کے بعد بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔

''میری آواز سنو'' میں جہاں سنجیدہ معیاری اور زندگی کی مثبت قدروں کے حامل گیت شامل ہیں وہیں غیر سنجیدہ ب یعنی مزاحیہ یا عام روش کے

مطابق اور متعلق گیتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ جس کے لیے کہانی کی نوعیت دھنوں کا تقاضہ اور ڈائرکٹر کی شرائط بھی بہت حد تک ذمہ دار ہے۔

آخر میں کیفی اعظمی کے نغموں کے متعلق سبودھ لال کے اس خیال پر اپنی بات ختم کرتی ہوں جو انہوں نے کیفی صاحب کی نغمہ نگاری کے بارے میں پیش کی ہے۔

''کیفی کی فلمی یا غیر فلمی شاعری کسی درجہ بندی کی محتاج نہیں، لہٰذا اگار یہ کہا جائے کہ ان کی فلمی شاعری میں باغیانہ اداشیلیندر کی نغمگی، مجروح کا تغزل، گلزار کی تجربہ پسندی سبھی شامل ہیں اور ساتھ ساتھ ان کا اپنا خصوصی رنگ تو یہ شاید کچھ لفظوں میں ان کے فلمی شاعری کے فن کو باد ھنے کی ایک کوشش ہی کہی جا سکتی ہے۔ اپنی کتاب ''میری آواز سنو'' کی ابتدا میں کیفی نے کہا ہے کہ شاید ان کے فلمی نغموں کو شائع کرنے والے دوست یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہی سنگیت اور گانے والوں کی آوازوں سے الگ کر کے ان گیتوں میں کچھ بچتا بھی ہے یا نہیں؟''۱۲

۱۹۷۴ء میں لکھا گیا سنکلپ فلم کا ایک گیت نظیر کی نظم سے مشتق ہے جو اس طرح سے ہے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ
دھن تیرے کان نہ آئے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ
کیا پایا ہے وہ بانٹ کے کھا کنگال نہ کر کنگال نہ ہو
جو سب کا حال کیا تو نے اک روز ترا وہ حال نہ ہو
اس ہاتھ سے دے اس ہاتھ سے لے ہو جائے سکھی یہ جگ سارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
اس سب کا مالک بن بیٹھا ہر کوئی قسمت پھوٹی
تھا اتنا منہ خزانے کا، دو ہاتھوں سے دنیا لوٹی
تھے دونوں ہاتھ خالی جب اٹھا سکندر بیچارہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ
دھن تیرے کام نہ آئے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ

(سنکلپ)

کیفی کے تمام نغمے اپنے اندر بڑے معنی سموئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۲ء میں ارتھ فلم کا یہ حسین نغمہ تحریر کیا جسے جگجیت سنگھ نے اپنی آواز میں گا کر اسے زندہ و جاوید کر دیا۔ جو اس طرح سے ہے۔

کوئی یہ کیسے بتائے کہ وہ تنہا کیوں ہے
وہ جو اپنا تھا وہی اور کسی کو کیوں ہے
یہی دنیا ہے تو پھر ایسی یہ دنیا کیوں ہے
یہی ہوتا ہے تو آخر یہی ہوتا کیوں ہے

ایک ذرا ہاتھ بڑھا دے تو پکڑے دامن
اس کے سینے میں سما جائے ہماری دھڑکن
اتنی قربت ہے تو پھر فاصلہ اتنا کیوں ہے
دل برباد سے نکلا نہیں اب تک کوئی

ایک لٹے گھر پہ دیا کرتا ہے دستک کوئی
آس جو ٹوٹ گئی پھر سے بندھاتا کیوں ہے

تم مسرت کا کہو یا اسے غم کا رشتہ
کہتے ہیں پیار کا رشتہ ہے جنم کا رشتہ
ہے جنم کا جو یہ رشتہ تو بدلتا کیوں ہے

اسی فلم کے ایک گیت میں وہ محبوبہ کے دل میں پیار کو تلاشتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بڑے ہی اچھے انداز میں وہ اپنے دل کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

جھکی جھکی سی نظر بیقرر ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں
تو اپنے دل کی جواں دھڑکنوں کو گن کے بتا
مری طرح ترا دل بیقرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں
جھکی جھکی سی نظر۔۔۔۔
وہ پل کہ جس میں محبت جوان ہوتی ہے
اس ایک پل کا تجھے انتظار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں

جھکی جھکی سی نظر۔۔۔۔
تری امید پہ ٹھکرا رہا ہوں دنیا کو
تجھے بھی اپنے پہ یہ اعتبار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں
جھکی جھکی سی نظر۔۔۔۔

(ارتھ)

کیفی اپنی ماں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ وہ عورت کے اس روپ سے حد درجہ متاثر تھے۔ انہوں نے 'ماں' کے ایک لفظ کو بڑے گہرے معنی اور خوبیوں کیساتھ ۱۹۷۰ء میں بنی فلم 'ماں کا آنچل' میں بڑی ہی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ جس کا ذکر ضروری ہے۔

ماں ہے محبت کا نام
ماں کو ہزاروں سلام
کر دے فدا زندگی
آئے جو بچوں کے کام
ماں ہے۔۔۔

ہنس کے اٹھائے غم
بیٹھے نہ ہار کے
پالے زمانے کو

اپنے کو مار کے
بھوک مٹائے سدا
پیاس بجھائے سدا
مانگے نہ قیمت نہ دان
ماں ہے۔۔۔۔

اس کے قدم چھونا
دنیا کی شان ہے
ہم کو ملا ہے جو بھی
ممتا کا دامن ہے
باغ لگاتی ہے ماں
پھول کھلاتی ہے ماں
ویدا اٹھاتی ہے ماں
دیتی ہے خوشیاں تمام
ماں ہے۔۔۔

چاہے بکھارن ہو خالی ہاتھ ہی
ماں تو ماں رہے گی ماں ہو کوئی ذات ہی
ممتا کی ذات تلے دیپ ہزاروں جلے

گود میں پلے اس کی سارے رشی سب امام

ماں ہے۔۔۔۔

(ماں کا آنچل)

زندگی مسلسل چلنے والا عمل ہے جو کسی بھی حالات میں رکتا نہیں۔ یہاں غم خوشی، اتار چڑھاؤ سب آتے جاتے رہتے ہیں۔لیکن زندگی کی رفتار اپنے وقت مقرر پر جاری رہتی ہے۔موت جیسے حالات سے بھی گزر کر انسان اپنے بھول جانے کی جبلت کی بنا پر اپنے وجود کو ٹکا کر رکھتا ہے۔اور رکھنا بھی چاہیے۔ اپنے اس پیغام ہو کیفی صاحب بڑے ہی دل فریب انداز میں فلم ''بہاریں پھر بھی آئیں گی میں پیش کرتے ہیں۔

جس زمانے میں کیفی صاحب نے شاعری کی ابتدا کی اس زمانے میں اردو میں رومانیت اور جمالیات کا رجحان غالب تھا۔اس کا شدید اثر کیفی صاحب کے خیالات واحساسات پر پڑا۔اور یہی رومانی جذبات وخیالات انکی نظم اور غزلوں میں اور پھر بعد کے زمانے میں فلمی گیتوں میں در آئے۔

رومانیت کے ساتھ ساتھ ۱۹۳۵ء کے بعد ایک اور غالب رجحان اشتراکیت کا تھا۔چنانچہ اشتراکی جذبات اور خیالات کا اثر بھی کیفی صاحب کی شاعری پر پڑا۔ ترقی پسند تحریک اسی روسی انقلاب کی دین تھی۔جس سے کیفی صاحب کے دل ودماغ دونوں متاثر ہوئے۔نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں اشتراکیت کا رجحان بڑھا اور ہر زبان کے ادب وادیب،شاعر وشاعری کو پوری طرح متاثر کیا۔

ہندوستان میں ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کا اعلان نامہ شائع ہوا۔اور ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں اس تحریک کی پہلی کانفرنس منقعد ہوئی۔جو ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے لئے ایک نئی زندگی اور مثالی سماج کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ۱۹۶۰ء کے بعد حالات میں کافی تبدیلی آئی۔کمیونیسٹ پارٹی کو ایک شدید کشمکش حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ترقی پسند تحریک کی اہمیت بھی پہلے کے مقابلہ میں کم اور کمزور پڑ گئی۔کیفی صاحب ان حالات سے متاثر ہوئے اور انکی شاعری میں ایک نیا موڑ آیا۔

کیفی صاحب کے شاعرانہ مقام ومرتبہ کا تعین کیا جائے تو انکی ابتدائی شاعری میں مذہبی خیالات کے ساتھ ساتھ رومانیت اور انقلاب کا رنگ نظر آتا ہے۔کیفی صاحب کی شاعری اشتراکی خیالات اور نظریات کی حامل نظر آتی ہے۔اس میں سادگی،سچائی،مناظر فطرت کا غالب رنگ محسوس ہوتا ہے۔

کیفی صاحب کی شاعری کے دوسرے دور میں اشتراکیت اور ترقی پسندانہ رجحانات کا غالب عنصر موجود ہے۔انہوں نے دانشتہ یا شعوری طور پر اپنی شاعری کا رخ وقتی اور ہنگامی حالات و مسائل اور انکے حل کی طرف موڑ دیا۔اس دور میں کیفی صاحب نے سیاسی حالات کو موضوع بنا کر اور سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو مرکز میں رکھ کر ایک سے بڑھ کر ایک نظمیں لکھیں۔اس طرح ہنگامی موضوعات بھی شاعری میں ڈھل گئے۔

آزادی کے بعد ملک کے حالات میں ہمہ جہتی تبدیلی آئی۔زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب آیا۔کیفی صاحب کی شاعری میں بھی انقلابی رجحان پیدا ہوا۔یہ انکی شاعری کا تیسرا دور تھا۔کیفی صاحب کی اس دور کی شاعری کا رنگ و آہنگ گزشتہ دونوں ادوار کی شاعری سے مختلف ہے۔اپنی اس دور کی شاعری میں بلند آہنگی، نعرے بازی کے بجائے ایک قسم کا ٹھراؤ اور سنجیدگی نظر آتی ہے۔اس میں ضبط و تحمل بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی۔

کیفی صاحب کی شاعری کی مجموعی خصوصیات یہی ہے کہ ترقی پسند شاعر ہونے کی وجہ سے انکی شاعری میں بھی ترقی پسندانہ رجحانات اور اسلوب رچ بس گئے۔کیفی صاحب کی شاعری کی ایک غالب خصوصیت یہ ہے کہ انکا اسلوب انکی اپنی پہچان و شناخت بن گیا ہے۔انکا کلام اپنے عہد اور ماحول کا ترجمان ہے۔

کیفی صاحب کی شاعری کا انداز خطیبانہ ہے۔تاہم اس میں سپاٹ بیان نہیں ہے کیونکہ اس میں انیس کے مرثیوں کی شیرینی اور منظر نگاری ہے۔کیفی صاحب کی بہنیں انہیں سوتے وقت انیس کے مرثیے سنایا کرتی تھیں جسکا اثر انکے

لاشعور کا حصہ بن گیا اور وہی تاثر بعد میں انکی شاعری میں جلوہ گر ہوا۔

کیفی صاحب کی شاعری میں طنزیہ اشارے بھی ملتے ہیں۔ ملک کے بدتر اور غیر اطمینان سے بھرے حالات، سیاسی لیڈروں کے نت نئے ہتھکنڈے، سماجی نا انصافیاں اور بھید بھاؤ میں کیفی صاحب کو شدت سے متاثر کیا اور انہوں نے ان سب کو اپنی شاعری میں نشانہ بنایا۔

کیفی صاحب نے اسکی فنی لوازمات پر بھی پوری توجہ دی ہے۔ اور اس کو حت الامکان برتا ہے۔ زبان و بیان کی خوبیاں بھی انکے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ انکی نظمیں فکر وفن کی معیار پر پوری اترتی ہیں۔ کیفی کی خصوصاً نظمیہ شاعری اردو شاعری میں اپنا ایک منفرد مقام وشناخت کی حامل ہے۔

کیفی صاحب کی فلمی شاعری کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ انکی فلمی شاعری میں بھی انہوں نے اپنا شاعرانہ موقف برقرار رکھا۔ اور فلمی نغموں کے حوالے سے اپنے ماضی الضمیر کو عوام، سماج اور ملک کے سامنے بہت ہی مؤثر طریقہ سے پیش کیا۔ دیگر فلمی شاعری کی صنف میں کیفی صاحب کا مقام ومرتبہ امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔

جن فلموں کا موضوع سماجی معاملات وطبقاتی نظام، استحصال اور حق تلفی کا پہلو ہوا انمیں انہوں نے اپنے گیتوں اور نظموں میں بہت ہی بہترین طریقے سے اپنے نظریات پیش کیے۔ جہاں حب الوطنی اور وطن پرستی کی بات آئی وہاں بے مثال اور سدابہار گیت لکھے۔ فلم "حقیقت" کا یہ گیت اسکی عمدہ مثال ہے۔

کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو!

اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو!
سانس تھمتی گئی، نبض جمتی گئی
پھر بھی بڑھتے قدم کو نہ رکنے دیا
کٹ گئے سر ہمارے تو کچھ غم نہیں
سر ہمالیہ کا ہم نے نہ جھکنے دیا

مرتے مرتے رہا بانکپن ساتھو!
اب تمہارے حوالے وطن ساتھو!

زندہ رہنے کے موسم بہت ہیں مگر
جان دینے کی رت روز آتی نہیں
حسن اور عشق دونوں کو رسوا کرے
وہ جوانی جو خوں میں نہاتی نہیں

آج دھرتی بنی ہے دلہن ساتھیو!
اب تمہارے حوالے وطن ساتھو!

راہ قربانیوں کی نہ ویران ہو
تم سجاتے ہی رہنا نئے قافلے

فتح کا جشن اس جشن کے بعد ہے
زندگی موت سے مل رہی ہے گلے

باندھ لو اپنے سر سے کفن ساتھیو!
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو!

کھینچ دو اپنے خوں سے زمیں پر لکیر
اس طرف آنے پائے نہ راون کوئی
توڑ دو ہاتھ اگر ہاتھ اٹھنے لگے
چھونا پائے سیتا کا دامن کوئی

رام بھی تم، تم ہی لکشمن ساتھیو!
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو!

(حقیقت)

کیفی صاحب نے اپنے ہم عصر شعراء سے تاثر آفرینی مستعار لی۔ اس کے ساتھ قدماء و پیش رو شعراء سے بھی اثر قبول کیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر وسیم انور لکھتے ہیں:

" کیفی نے اپنے ہم عصروں سے اثرات قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیش رو اور قدیم شعراء کی تخلیقات سے بھی استفادہ کرتے ہوئے اپنی شاعری کو آب و رنگ عطا کیا ہے۔ انیسؔ کی تصویر کشی، اخترؔ شیرانی کی رومانیت، جوشؔ کی بلند آہنگی اور گھن گرج اقبالؔ کی حکایت، حالیؔ کی سادگئی بیان، اکبرؔ کا تنز وغیرہ کے ساتھ ساتھ شبلیؔ، ظفر علی خاںؔ، اسماعیل میرٹھیؔ اور غالبؔ وغیرہ کا طرز اختیار کرنے کی روش ملتی ہے۔" [1]

کیفی کی نظموں میں آفاقیت اور تاریخیت کا تصور بھی ملتا ہے۔ آفاقیت سے مراد وہ نظمیں ہیں جن میں مختلف ادوار میں اس دنیا میں انسانی زندگی میں ان کے عالمی مسائل کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ زندگی میں ان کے عالمی مسائل وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔

تاریخیت سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی کی طویل زندگی کی تاریخی حیثیت اور نوعیت۔ انسانی زندگی کے مختلف مراحل اور مدارج ان کا شدید احساس کیفی صاحب نے اپنے حالیہ تجربات و محسوسات کو کسی تاریخی حقیقت یا واقعہ کے حوالے سے زیر بحث لایا ہے اس کے لئے انہوں نے اپنا ایک منفرد اسلوب اور پیرایہ بیان اختیار کیا ہے چنانچہ معروف نقاد پروفیسر محمد حسن اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ابن مریم اور زندگی دونوں میں اس انسان کی بپتا ہے جو صدیوں سے طرح طرح کے مظالم اور استحصال کا شکار رہا ہے اور موت کے خوف سے مختلف کے توہمات میں پناہ لیتا رہا ہے۔۔۔۔۔ مختلف زمانوں پر پھیلے ہوئے انسانوں کے لئے مرکزی معنویت رکھنے والے احساسات، کیفیات اور تصورات کو شعری اظہار بخشنے کے لئے

کیفی صاحب کونئی ایجری ہی نہیں نیا علامتی پیرایہ ایجاد کرنا پڑا۔" ۲؎

کیفی کا پہلا مجموعہ کلام "جھنکار" ۱۹۴۱ء اور دوسرا مجموعہ "آخری شب" آزادی سے کچھ عرصہ پہلے یعنی ۱۹۴۷ء کے اوائل میں منظر عام پر آیا۔ ان مجموعوں میں شامل نظموں میں نازیوں کے خلاف سویت عوام کی جنگ اور انکی کامیابی کے لئے ہندوستان کے ساتھ ساری دنیا کے محنت کش عوام کے حوصلہ اور ہمت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ سرخ جنت، روسی عورت کا نعرہ، اعتراف، روسی عوام اور جنگ، یلغار وغیرہ اسی نوعیت کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں لاکھوں ہندوستان عوام کے دلوں میں نازی درندوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کئے ہیں۔

کیفی صاحب کی شاعری کی ایک جہت صنف نازک سے ہمدردی اور اسے اپنے ساتھ انقلابی سرگرمیوں میں شریک اور سرگرم عمل کرنے کا بھی۔ انہوں نے اردو شاعری کو عورت اور محبوبہ کا تصور نئے ڈھنگ سے دیا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد میں دیکھا کہ زندگی کے ہر میدان میں عورت شانہ بہ شانہ محنت و مشقت کر رہی ہے۔ زندگی کے ہر محاذ پر مرد کے ساتھ ساتھ عورت بھی شریک کار ہے۔ عورت کے بارے میں کیفی صاحب کا یہ رویہ انکے بہت سے ہم عصروں سے جداگانہ یا مختلف رہا ہے۔ کیفی صاحب نے عورت کو حسن و جمال کا پیکر ضرور سمجھا لیکن انقلابی سرگرمیوں میں وہ مرد کے شانہ بہ شانہ دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ انکے ہم عصر مقبول شاعر مجاز لکھنوی نے تو اپنی محبوبہ سے صرف یہ درخواست کی تھی کہ

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

کیفی صاحب کے ہم عصر دوسرے شاعر ساحر لدھیانوی نے حالانکہ مرد کے
ہاتھوں عورت کی محکومی اور پامالی کی شکایت اور احتجاج تو کیا لیکن وہ بھی صرف اتنا کہہ
کر خاموش ہو گئے کہ

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر لو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اس کے مقابل کیفی صاحب کی آواز ایک منفرد اور نئی آواز ہے۔ ذیل کی
مشہور و معروف نظم "عورت" کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عورت یا محبوبہ کے
ارتقاع سے انکا نظریہ کس قدر الگ اور نیا ہے۔ نظمکے کچھ بند ملاحظہ فرمائیں۔

اُٹھ میری جان! میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
تیرے قدموں میں ہے فردوس تمدن کی بہار
تیری نظروں پہ ہے تہذیب و ترقی کا مدار
تیری آغوش ہے گہوارۂ نفس و کردار
تابہ کے گرد تیرے وہم و تعین کا حصار
کوند کر مجلسِ خلوت سے نکلنا ہے تجھے
اُٹھ میری جان! میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

مزکورہ نظم کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ عورت کو طرح
طرح اپنا غلام اور عیش و عشرت کا سامان بنانے کے فرسودہ اور دیرینہ طرز احساس کے
خلاف انہوں نے عورت کو اس زنجیر اور فریب سے آزاد ہونے کی دعوت دی۔ اپنی
ایک دوسری مشہور نظم "اخفائے محبت" میں بھی کیفی صاحب نے محبت کی آواز کو ایک

مثبت اور آزاد انسانی قدر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

کیفی اعظمی کی شاعری کی ایک نمایاں صنف انکی قومیت اور عوام پسندی ہے۔ انہوں نے اپنے اطراف کی عدم کو اپنی شاعری کے مرکز میں رکھ کر بات کی ہے۔ وہ خواص کے اونچے اونچے محلات سے نیچے اتر کر عوام کے ساتھ ننگے پاؤں چلتے چلتے زخمی اور شکستہ حال ہونے کے باوجود وہ حراساں نہیں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ساتھ عوام اور جمہور کا ایک ہجوم پاتے ہیں۔ اور اپنی آواز کو ہجوم کی آواز کے ساتھ ملانے میں سرگرم اور کوشاں رہتے ہیں۔ دوسری طرف ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہجوم انکی آواز پر لبیک کہہ کر انکے دوش بدوش سرگرم عمل ہے۔

حق بات تو یہ ہے کہ کیفی صاحب کی شاعری ہمہ جہت خصوصیات کی حامل ہے۔ کسی ایک موضوع یا جہت پر اظہار کر لینے سے انکی مکمل شخصیت کا انکشاف ناممکن ہے۔ اس مقالے میں شامل دیگر ابواب کے تحت لکھے گئے منفرد مضامین کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جائیگی کہ کیفی صاحب کی ابتدائی شاعری رومانیت اور جمالیات کے عناصر سے بھرپور ہے۔ اسکے بعد انکی شاعری ظلم وستم اور ناانصافی کے خلاف مکمل احتجاج ہے۔ اپنی شاعری کے آخری دور میں کیفی صاحب انسانیت، محبت اور عالم گیر احسن و آشتی کے شاعر نظر آتے ہیں۔

کیفی صاحب کی اولین نظمیں مثلاً ملاقات، نظرانہ، عورت وغیرہ رومانی جذبات سے لبریز ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے کیفی صاحب کی ایسی نظموں کو خوبصورت اور تراشی ہوئی نظموں سے تعبیر کیا ہے۔

کیفی صاحب کی شاعری کی دوسری جہت سماجی وسیاسی اقدار سے عبارت

ہے۔اس دور میں اس نوعیت کی نظموں میں غم وغصہ کا اظہار کھل کر کرتے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ کیفی صاحب کو اسی نوعیت کی نظموں سے شہرت دوام حاصل ہوئی۔
عوام تو عوام ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزار مثلاً سجاد ظہیر، علی سردار جعفری وغیرہ ایسی نظموں کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔

کیفی صاحب کی تیسری نوعیت کمیونیزم ہے۔کمیونیزم کی شکست یا زوال سے متاثر نظر آتی ہے۔زوال روس کے بعد ہندوستان میں بھی کمیونسٹ پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا۔جسکا انہیں بہت رنج ہوا۔لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور صبر و استقلال سے کام لے کر اپنے مشن کی تکمیل کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔

نئی زمین نیا آسماں بھی مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

اور پھر یہ شعر کہ

بانئ جشن، بہاراں نے یہ سوچا بھی نہیں
کس نے کانٹوں کو لہو اپنا پلایا ہوگا

کیفی صاحب کی شاعری کے بارے میں شاعرِ ادب کا خیال مختلف ہے۔
سجاد ظہیر نے کیفی صاحب کی شاعری کے بارے میں بڑا ہی تاریخی جملہ کہا ہے کہ " کیفی کی شاعری قدیم وجدید ادبی غلاظتوں سے پاک ہے۔"
کرشن چندر کا خیال ہے کہ " کیفی کی شاعری صرف پتھر دل کی شاعری نہیں وہ ایک نرم دل انسان کی شاعری بھی ہے۔"

فیضؔ کا کہنا ہے کہ " کیفی کی شاعری کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے"، جبکہ خلیل الرحمٰن اعظمی انکی کچھ نظموں کو اچھا مانتے ہیں۔ انکے نزدیک کیفی کی اجتماعی نظمیں قابل توجہ نہیں ہیں۔

کیفی کی شاعری کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ حالیؔ نے جس قسم کی شاعری کا خواب دیکھا تھا کیفی صاحب نے اسے عملی جامہ پہنایا۔ بقول حالیؔ " شاعری میں محبوب کے حسن و جمال وزیبائش، قد و گیسو، لب و رخسار اور زلف و کمر کا بیان بیکار و بے معنی ہے"۔ اسکے علاوہ ہجر و وصال کے قصہ شیخ و ناصح کی باتیں سب بے وقت کی راگنی ہے۔ کیفی صاحب نے بھی شاعری میں ایسے فرسودہ انداز فکر سے انحراف یا صرف نظر کی۔ اور اصلاح معاشرہ اور سماج کی تعمیر نو کی طرف اپنی شاعرانہ صلاحیت کا رخ موڑ دیا۔

از ابتدا تا انتہا کیفی صاحب کی مکمل شاعری سماج کے ناقص نظام کے خلاف بغاوت ہے۔ انہوں نے بے کس عوام کی فریادرسی اور انکے مسائل کے حل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

اس زمانے میں سماجی مسائل کا کینواس بھی کافی وسیع تھا۔ سماج میں طرح طرح کی ناہمواریاں، ناانصافیاں، حق تلفیاں سر اٹھا رہی تھیں۔ عورت مرد کے ہاتھوں عیش و عشرت کا کھلونہ بن رہی تھی۔ کیفی صاحب نے ان سب کی مسیحائی کی۔ اپنی شاعری کی سب کی حمایت اور دلجوئی کی۔

کیفی صاحب نے اقدار کی بھی پاسداری کی۔ یہ بات الگ تھی کہ وہ مسجد میں نماز پڑھتے نظر نہیں آئے لیکن جب بابری مسجد شہید کی گئی تو وہ تڑپ گئے۔ انہیں

بہت رنج ہوا۔ دوسرے شعراء نے اس سانحہ کو موضوع بنا کر احتجاجی نظمیں لکھیں لیکن کیفی صاحب کی نظم "دوسرا بن باس" کا جواب ہی نہیں۔

کیفی صاحب کی شاعری کا ایک رخ شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کے انسانی عظمت کی فلسفہ سے بھی مشابہہ ہے۔ دنیا میں نوع انسانی کی عظمت و اہمیت، اسکی افضلیت اور رفعت کا اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا ذکر کیا ہے۔ اور یہ عظمت و افضلیت روحانی نہیں بلکہ مکمل معنوی اور عقلی اعتبار سے مقصود ہے۔ فارسی شاعری میں اس نظریہ کے مدعی اور بانی حضرت مولانا روم ہیں۔ اور علامہ اقبالؔ نے اس پر اپنے تصورات وخیالات کی بنیاد قائم کی۔ انسانی قدروں کی ایسی ہی پاسداری پر عمل کر کے ایک صالح اور تندرست سماج کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ کیفی صاحب اس دستور اور نظام کو قائم کرنے اور اسے مستحکم کرنے میں تمام عمر سرگرداں اور کوشاں رہے۔

انکے دونوں مجموعہ کلام "جھنکار" اور "آخر شب" میں اس نظریات اور تصورات کے حامل کلام کی صدائے بازگشت کی گونج اغلب نظموں میں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کیفی صاحب کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور جس نظام و نظریہ پر انہوں نے یہ خواب دیکھا تھا وہ اس عمارت کی بنیاد شکست روس کی شکل میں ڈھل گئی تھی۔ انکے سجدہ آوارہ ہو گئے اور آخرش انہوں نے ابلیس کی ایک اور مجلس شوریٰ بلائی جس میں انہوں نے اس حالت پر پہنچ کر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور کہتے ہیں۔

نشانات ستم بھرّا رہے ہیں
حکومت کے علم ٹھرا رہے ہیں
غلامی کا قدم تھرّا رہے ہیں

غلامی اب وطن سے جا رہی ہے

اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

کیفی صاحب کے مذکورہ خیالات وتصورات کو علامہ اقبالؔ کے فلسفہ سے بہت مماثلت نظر آتی ہے۔ خاص طور پر اقبالؔ دیوان پیام مشرق اسی فلسفہ کا حامل ہے۔ مختصر یہ کہ ایک ہی مضمون کا حامل کلام دونوں شعراء کے یہاں جا بجا ملتا ہے۔ فرق صرف انداز بیان کا ہے۔ اقبالؔ کا انداز بیاں کیفی صاحب کے انداز بیاں سے کافی الگ ہے۔

اقبالؔ کے مطابق زندگی کو کسی پل سکون وقرار نہیں ہے۔ وہ ہر لمحہ مضطرب اور متحرک ہے۔ ٹکراؤ اور موجود زوال کی علامتیں ہیں کہتے ہیں۔

شہید ناز او بزم وجود است

نیاز اندر نہاد ہست و بود است

اسی فلسفہ کو کیفی صاحب یوں کہتے ہیں۔

قیامت ہر طرف منڈلا رہی ہے

زمیں ہچکولے پیہم کھا رہی ہے

جب اقبالؔ کہتے ہیں کہ

کجاست منزلے ایں خاکدان تیرہ نہاد

کہ ہر چہ ہست چو ایک رواں بہ پرواز است

تو کیفی صاحب کہتے ہیں۔

اسی کا ہے ساحل اسی کے کنگارے

تلاطم میں پھنس کر جو دو ہاتھ مارے
اندھیری فضا سانس لیتا سمندر
یوں ہی سر پٹکتے رہیں گے یہ دھارے

کیفی صاحب کو کسی ایک طبقہ کی حاکمیت اور تسلط منظور نہیں۔ وہ مارکسزم کے زیر اثر مساوات کے حامی اور علم بردار ہیں۔ اس کے لئے مسلسل جد و جہد، حرکت و عمل نیز اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں

شمشیر بکف جنگ کے میدان کی طرف دوڑ
آندھی کی طرح آگ کے طوفاں کی طرف دوڑ
ہاں لٹتی ہوئی عظمت انساں کے طرف دوڑ
ہاں مٹتا ہوا حضرت آدم کا نشاں دوڑ
بھارت کے جواں، اے میرے بھارت کے جواں دیکھ۔

اسی حالت اور تصور کو علامہ اقبال نے یوں پیش کیا:

تا شوی بیباک ترو ر نالہ ای مرغ بہار
آتشی گیر از حریم سینہ دم چندی دگر

کیفی صاحب ایک کامیاب اور منفرد لب ولہجہ کے شاعر تو تھے ہی لیکن وہ ایک منفرد نثار بھی تھے۔ انہوں نے کئی مضامین بھی لکھے جس میں اپنے فلسفہ حیات و نظریات زندگی کو بہت ہی مئوثر طریقے سے واضح کیا۔

کیفی صاحب نے خاص طور پر طنز و مزاح کے حوالے سے اپنے خیالات و

تصورات کو پیش کیا ہے۔انہوں نے مذہب، سیاست، اقتصادیات، سماجیت وغیرہ
موضوعات پر طنز و مزاح کے اچھے نمونے پیش کئے۔

کیفی صاحب کے متفرق مضامین کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نثر نہایت ہی نکھری ہوئی ہے جس میں شگفتگی بھی ہے۔ سنجیدگی بھی، لطافت بھی ہے اور متانت بھی۔ ان کا اسلوب قابل تعریف ہے ان کی اس نثری خصوصیات کے ذیل میں نرلیس ندیم لکھتے ہیں۔

"انکی نظم میں لکھی گئی نثر انکی کافیا پیمائی میں ایک طرح کی نغمگی ہے۔ جو پاٹھک کو نہ صرف باندھے رکھتی ہے بلکا سے دائمی اپنائیت کا رشتہ بھی قائم کراتی ہے" ۳؎

کیفی صاحب کے اسلوب نگارش کا ایک دوسرا رخ یہ ہے کہ "اردو تنقید نے ایک مدت تک مرثیہ کو قابل اعتناء سمجھا۔ نہ اردو شاعری میں اسکا مقام کا تعین کیا۔ ہمارے تزکرہ جو غزل کو اردو شاعری کا فکری سرمایہ سمجھتے اور پرکھتے رہے انہوں نے پہلی مرتبہ مرثیہ کی طرف تب توجہ دی جب شبلی نے موازنہ لکھا۔ موازنے نے صرف انیسؔ ہی کو نہیں مرثیہ کو بھی اردو شاعری میں بلند درجہ دیا" ۴؎

جیسا کہ عرض کیا گیا کیفی صاحب نے مختلف شخصیات پر مستعدد مضامین بھی لکھے ہیں۔ حال ہی میں نشاط شاہدوی پر انکا مضمون ترسیل ممبئی میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے ناصرف نشاط کی شاعرانہ صفات کو منور کیا ہے بلکہ اپنے تعلقات کو بھی بڑے مئوثر پیرائے میں بیان کیا۔ نشاط کم عمری میں ہی انتقال کر گئے لیکن انکی ترقی پسند فکر نے کیفی صاحب جیسے دوسرے ترقی پسندوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ کیفی

صاحب کا یہ مضمون اسی ہم آہنگ کی دین ہے۔ مثلاً اسی مضمون کا یہ اقتباس دیکھئے۔

"نشاط نے خود بہت کم عمر پائی تو انکی شاعری، تجربات، مشاہدات، شعور وفن کی ومنزلیں کیسے طئے کرتیں جس کے لئے ایک طویل عمر بھی چاہئے، لیکن اس نے اپنی مختصر سی عمر میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے قابل توجہ ہے، اسکے ابتدائی اور آخری کلام میں نمایاں طور پر ایک تدریجی ارتقا دکھائی دیتا ہے، صورت کے اعتبار سے بھی اور معنی کے اعتبار سے بھی۔ اس کی شاعری اس آگ میں تپ کر نکھر رہی تھی جو دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھڑک اٹھی تھی۔ ریاستی پرجا کی بیماری، کسانوں کی تحریکیں، شہروں میں ہڑتالیں اور مناظروں کی لہر، ممبئی میں نیوی کی بغاوت۔ نشاط اسی ابال سے اپنی نظموں کے لئے مواد بھی حاصل کرتا تھا اور آب و رنگ بھی اور جب قومی رہنماؤں نے اس ابال سے غداری کر کے سامرادی دہلیز پر سر رکھ دیا تو نشاط کے فن کی دھار اور تیز ہوگئی۔ اب وہ سامراجی لیڈروں کے ساتھ ساتھ ان رہنماؤں کو بھی للکارنے لگا جو دیسی رجواڑوں، بڑے بڑے جاگیرداروں اور مٹھی بھر اجارہ دار اور سرمایاداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس نے عوام کی لاکھوں، کروڑوں آنکھوں سے دیکھا کہ

سیاسیات کے شاطر قمار خانوں میں — بچی کچی سی شرافت بھی بیچ آئے ہیں
علاج دل کی خاطر طبیب مغرب کو — دھڑکتے دل کی حرارت بھی بیچ آئے ہیں

ان مصرعوں میں نشاط نے کروڑوں دلوں کا کرب مشتعل کر دیا ہے وہ

سامراجی لیڈروں کو مبارکباد دیتا ہے۔

میرے عزیز، میرے محترم، میرے آقا تیری ہوس کو نئی زندگی مبارک ہو
تیری نگاہ تیرے دل نواز ہونٹوں کو یہ زہر خند میں ڈوبی ہنسی مبارک ہو"

۵

مختصر یہ کہ جس طرح کیفی کی شخصیت صد رنگ کی حامل تھی اسی طرح ان کا کلام بھی کثیر الجہات خصوصیات کا حامل ہے۔ ان کے کلام کی رنگا رنگی اور نیرنگیاں تو ان کے عمیق مطالعے سے ہی محسوس کی جاسکتی ہیں۔ سچ ہے کیفی صاحب جیسا کئی صفات وخصوصیات کا حامل شاعر فلمی دنیا میں بھی آج تک پیدا نہیں ہوا۔ فلمی شاعر پر انکی انفرادیت وہمہ توجہتی کی چھاپ تادیر مسلم رہے گی۔

حواشی؛

۱ کیفی اعظمی: شخصیت شاعری اور عہد، ڈاکٹر وسیم انور ص ۲۸۶، ۲۸۵

حواشی

۱ ڈاکٹر وسیم نور شخصیت شاعری اور عہد ص ۲۸۶، ۲۸۵

۲ ڈاکٹر محمد کیفی اعظمی نئی تہداری کے شاعر، کیفی اعظمی فن اور شخصیت، شاہد ماہلی ص ۱۰۲

۳ ینم احمد سنگم آعظمی، کیفی اعظمی کی نثر میں طنز و مزاح، کیفی،، ڈاکٹر شہاب الدین ص ۲۴۴،

۴ ایضاً ص ۲۴۴

ماحصل

کسی بھی شخصیت کی تشکیل وتعمیر میں خارجی وداخلی عناصر شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ جہاں تک خارجی پہلوؤں کا تعلق ہے اس میں سماجی حالات، جغرافیائی حالات اور طرز بود و باش کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شخصیت کی مجموعی تشکیل میں داخلی عناصر کی بھی خاص اہمیت ہے۔ ناقدین کا خیال یہ ہے کہ شخصیت کی تشکیل میں تین چوتھائی خارجیت اثر انداز ہوتی ہے۔ جبکہ صرف ایک چوتھائی انفرادیت کا دخل ہوتا ہے۔ انفرادیت سماجی تغیرات اور مفروضات کے پردے میں اپنا اظہار کرتی ہے۔

کیفی صاحب کی کی انفرادی شخصیت کی نشو نما میں سماجی تغیرات کے ذیل میں غور کرنے پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کیفی صاحب کہ گھر خاندان کا ابتدائی ماحول مذہبی، قدامت پرست ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ اور ادبی بھی تھا۔ انکے والد اور تینوں بڑے بھائی بھی کامیاب اور اچھے شاعر تھے۔ انکی چار بہنیں جو ایک کے بعد دیگر تپِ دق کے مرض میں ہلاک ہوگئیں وہ بھی تعلیم یافتہ تھی لیکن کیفی صاحب کی طبیعت گھر وسماج کے دقیانوسی ماحول سے یکسر بیزار تھی۔ جب انہیں لکھنؤ کے مشہور مدرسہ سلطان المدارس میں عربی پڑھنے اور مولوی بنانے کے لئے بھیجا گیا تو وہ وہاں سے بھی باغی بن کر نکل آئے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات چند ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ وہ ترقی پسند خیالات اور نظریات کے حامل ہوگئے۔ انھوں نے ابتدا ہی سے مارکسزم ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ کیفی صاحب ممبئی کی مزدور بستیوں میں نشستیں کرتے اور انقلاب آفرین نظمیں پڑھتے۔

ممبئی میں قیام کے زمانے میں کیفی صاحب پارٹی کے ہمہ وقت کارکن بن کر رہے اس زمانے کے قومی لیڈر مثلاً سبھاش چندر بوز، بھگت سنگھ اور جواہر لال نہرو وغیرہ سے متاثر ہوئے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی کیفی صاحب پیش پیش رہے۔ اور قلمی جہاد مسلسل کرتے رہے۔ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد بھی مادر وطن کے سیاسی اور سماجی مسائل کے حل کے لئے فکرمند اور برسرِ عمل رہے۔

کیفی صاحب نے اپنے دور کے حالات کا شدت سے مطالعہ کیا۔ اور اسکا اثر انکے دل و دماغ پر شدید پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے فلمی دنیا میں اور فلمی دنیا کے علاوہ جو کچھ بھی لکھا اس میں انکی ہمہ جہت شخصیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

الغرض کیفی صاحب اپنے عہد اور اپنے ماحول کی پیداوار تھے۔

انکی تخلیق اور فلمی شاعری میں بھی انہی حالات و کیفیات اور زمانے کے سرد گرم کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی انکے مختلف شخصیات پر لکھے ہوئے مضامین بھی انکی تنقیدی بصیرت کی پہچان بنے ہیں۔ انکا مضمون جو انہوں نے نشاط شاہدوی پر لکھا ہے انکی انتقادی جہد کی شناخت ہے۔

دور ہر چند فلمی شاعری بہت ساری پابندیوں کا احساس رکھتی ہے۔ تاہم انہوں نے فلموں میں بھی اپنے نظریات کی پیشکش اور فلمی حالات کے مدنظر اپنے جذبہ و احساس کو پیش کرنے کی راہ نکال لی۔ انکی نظموں میں اگر انقلابی آہنگ اور ولولہ انگیز پیغام ہے تو حالات کے سبب سے ہے۔ غزلوں میں نغمی و ترنم ہے تو انکی شاعری سے رغبت اور فن سے واقفیت کی دین ہے۔ فلمی نغموں کا حسن بھی اسی وراثت سے ہم آہنگ کا پیدا کردہ ہے۔